فوزیہ انور
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریایونیورسٹی ملتان ۔
ڈاکٹر محمد خاور نوازش
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریایونیورسٹی ملتان ۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ نگاری

Fozia Anwar
PhD Scholar, Department of Urdu, BZU Multan.
Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Associate Professor, Department of Urdu, BZU Multan.

Literary Historiography of Dr. Tabassum Kashmiri

Dr. Tabassum Kashmiri is one of the renowned historians of Urdu. Although he wrote criticism and creative writings also but historiography has always been a leading reference to his identity. Dr. Tabassum Kashmiri"s book "Urdu Adab Ki Tareekh: Ibtda Sey 1857 Tak" was published in 2003. In that work, he not only wrote a comprehensive history of Urdu Literature till 1857 but also presented a unique concept of literary historiography in Urdu. In his view, history, research and criticism should be looked at separately and while reading may be differentiated easily by any reader. The element of research and criticism should not be so prevalent in it that the historical flow is affected. In this article, an attempt has been made to highlight the important aspects of literary historiography in the light of the views expressed by Dr. Tasbam Kashmiri in various references on historiography from the said work.

Key Words: *Literary, Historiography, Urdu, Criticism, Creative.*

ادب اور تاریخ کا باہمی رشتہ اتنا ہی گہرا ہے جتنا کہ ادب اور معاشرے میں بسنے والے لوگوں کا۔ تاریخ جس سماجی ارتقا کی تصویر کشی ہوتی ہے وہ انسانوں اور اُن کی ثقافتوں سے ہی عبارت ہوتا ہے۔ جب بنیادی اہمیت ہی انسانوں کی ہے تو ظاہر ہے کہ اُن کے جذبات و احساسات کی لطیف ترجمانی کا فریضہ انجام دینے والا ادب بھی کسی طرح سماجی ارتقا سے کٹی ہوئی شے نہیں ہو سکتا۔ گویا تاریخ میں اگر کسی خطے کے باسیوں کے دُکھ سکھ اور اُن سے

پھوٹنے والے احساسات و جذبات کی ترجمانی نظر نہ آئے تو وہ محض واقعات کا بیان اور معلومات کا ذخیرہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اُردو کے سب سے معتبر ادبی مورخ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> "اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی تاریخ کو بھی ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں مکمل زندگی کی رُوح کا سایہ نظر آئے.... بنیادی طور پر میں نے "ادب" کو ادب کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ لیکن کلچر، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے میں نے تاریخ ادب کو ایک وحدت اکائی بنانے کی کوشش کی ہے۔"(۱)

تاریخ نگاری ایک ایسا میدان ہے جو خالصتاً انسانی مساعی سے جڑا ہوا ہے کیونکہ اس میں کچھ بھی مکینیکل نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر مبارک علی کے خیال میں تاریخ نویسی میں پہلی چیز واقعات ہیں، دوسری اُن واقعات کی تحقیقی انداز پر جانچ اور پرکھ اور تیسری اُن واقعات پر تاویلات اور انتقاد ہے(۲)۔ اب یہ تینوں اُمور کسی فارمولے میں ڈھل سکتے ہیں نہ ہی کسی پہلے سے موجود سانچے میں ڈال کر تاریخ کی کتاب کی شکل میں بر آمد ہو سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس میں مورخ کسی حد تک آزاد بھی ہے یعنی اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ کسی واقعے کو ایک مخصوص تناظر میں اتنا ہی اہم سمجھے جتنا متقدمین نے سمجھا بلکہ وہ اُس واقعے کا ایک منفرد تناظر بھی سامنے لا سکتا ہے۔ ادبی تاریخ نگاری میں یہ آزادی اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس میں داخلی شہادت کسی عہد کا وہ ادب ہے جس کا تجزیہ کر کے اُس عہد کے مجموعی ثقافتی رویوں کو سامنے لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُردو ادب کی تاریخ لکھ کر کچھ ایسے سنجیدہ سوالات پیدا کر دیئے کہ اس سے قبل لکھی گئی اُردو ادب کی جملہ تاریخیں بھی اُن سوالات کی زد میں آ گئیں۔ اُردو کی ادبی تاریخ نگاری کا سفر رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادبِ اُردو" سے شروع ہوتا ہے جو ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ تاریخ پہلے انگریزی میں لکھی گئی۔ مرزا محمد عسکری نے اسے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد متعدد تواریخ شائع ہوئیں لیکن ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" منظرِ عام پر آئی تو ادبی تاریخ نگاری کے حوالے سے ایک سنجیدہ مکالمے کا آغاز ہوا۔ اس مکالمے کی بنیاد ادبی تاریخ کے بارے میں وہ تصورات تھے جن سے گزشتہ ادبی تواریخ میں اغماز برتا گیا اور جن کی غیر موجودگی نے ادبی تواریخ کی وقعت کو بھی متاثر کیا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں ہمیں ادبی تاریخ کے ایک ایسے تصور کی ضرورت ہے جو ادب اور اس کے قارئین کے ساتھ تاریخ کے رشتے کو سمجھے۔ اس ضمن میں وہ انلس دبستان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"انلس دبستان نے یہ زوردار آواز بلند کی تھی کہ تاریخ میں اب شعبہ جاتی مطالعات کا دور گزر گیا ہے یعنی سماجی تاریخ اب صرف سماجی تاریخ کا نام نہیں۔ یعنی کسی خاص عہد کی سماجی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دوسرے متعلقہ علوم سے بھی مدد لیں گے۔ لہٰذا جب ہم کسی خاص ادبی دَور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ہم اس دَور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس دَور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔ اس مطالعہ میں بنیادی اہمیت تو ادب ہی کو حاصل رہے گی مگر ادب پر اثر انداز ہونے والے دیگر عوامل اور محرکات کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ کریں گے۔" (۳)

اس تصور کے پسِ منظر میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُردو ادب کی اَب تک منظرِ عام پر آنے والے ادبی تواریخ پر کچھ سوالات اُٹھاتے ہوئے کہا کہ ان تواریخ میں ادبی تاریخ نگاری کا مذکورہ بالا تصور سرے سے ہی موجود نہیں ہے اور اَب تک ادبی تاریخ نگاری کے روایتی تصور پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں اُردو کی ادبی تاریخ کے کسی بھی مورخ نے تاریخ لکھتے وقت ایک جامع منصوبے کو سامنے نہیں رکھا۔ نہ اس کے اُصول طے کیے اور نہ ہی اس کے دائرہ کار کا تعین کیا جبکہ مغرب میں کسی بھی کام سے پہلے اُسے ایک خاکے کی شکل میں سامنے رکھا جاتا ہے اور پھر سارا کام اس کی روشنی میں آگے بڑھتا ہے۔ اسی لیے اس کام کی وقعت بھی بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری مزید کہتے ہیں:

"ادبی مورخ جب تاریخ لکھتا ہے تو وہ ہر دور کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی تاریخ کی تعبیر کرنے کے ساتھ ساتھ ادب کی تحسین اور تجزیہ کا کام بھی کرتا ہے۔ پھر یہ سارا کام ادب کی زمانی حرکت کے تصور سے معمور ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صاحب بصرت ادبی مورخ کسی دَور کے ادب کو تہذیبی، ثقافتی، سیاسی و سماجی حوالوں سے دیکھتا ہے اور پھر اس ادب کی تنقید، تحسین یا تجزیہ کرتا ہے اس عمل میں اس کی بصیرت ادبی تاریخ کے کسی ایک دور کا ویژن پیدا کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ویژن کی مدد سے تاریخ کے غیر حاضر، یا نظر نہ آنے والے تصورات کو اپنی ویژنری

طاقت سے سامنے لاتا ہے یہی خوبی اس کا طرۂ امتیاز بنتی ہے۔ وہ تاریخ کے غیر حاضر تصورات کو زندہ کر کے حاضر کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" (۴)

اُن کے مطابق ایک معیاری ادبی تاریخ میں ادب کی زمانی حرکت کا تصور موجود ہونا چاہیے۔ ایک اچھی تاریخ میں قاری کے سامنے ادب کی زمانی پرتیں کھلتی جانی چاہئیں کہ ادب ایک عہد سے رُخصت ہو کر کس انداز میں دوسرے دور کا حصہ بننے جارہا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ معیاری تاریخ کہلوانے کے لائق نہیں ہو گی۔ بد قسمتی سے اُردو ادب کے مورخین ابھی تک ادبی تاریخ کے فرسودہ تصورات کے سہارے ہی کام چلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ادب کی زمانی حرکت کا اس عہد کے سیاسی و سماجی تناظر سے ایک گندھا ہوا تعلق بھی ہوتا ہے۔ ادب یا تو اُس سیاسی یا ثقافتی تناظر میں آگے بڑھتا ہے یا پھر اُس تناظر پر کسی نہ کسی طور اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ان تعاملات کی بازیافت بھی ایک اچھے مورخ کی ذمہ داری ہے اور اگر ایک مورخ ان تعاملات کا کھوج لگالیتا ہے تو ادب کی فکری اور فنی سطحوں کا بخوبی تجزیہ کر سکتا ہے۔ مزید برآں اس کھوج میں اگر کوئی تحقیقی معاملہ اس کی دسترس میں آجاتا ہے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں اس تحقیق کا اجمالی بیان ہی ادبی مورخ کے لیے کافی ہو گا کیونکہ تحقیق تاریخ نگاری سے بہر صورت الگ میدان ہے اور اس تحقیق کا بیان الگ سے کسی تحقیقی مقالے یا کسی دوسرے ایسے منصوبے کا حصہ بننا چاہیے۔ تاریخ پر تفصیلی تحقیق کا بوجھ ڈالنا کسی طور پر احسن کام نہیں ہے۔ وہ رقم طراز ہیں :

"اُردو ادب کے مورخین کا یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ جوش تحقیق میں اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ان کا اصل کام تو ادبی مواد کی تحسین و تفہیم ہے۔ ادیبوں کے بارے میں صرف خام مواد فراہم کرتے چلے جانا اور حقائق بیان کرتے چلے جانا ان کا فریضہ نہیں ہے۔ یہ کام تو ادب کی تاریخ میں جزوی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے بہتر میدان ادبی تحقیق کا ہے جو الگ شعبہ ہے۔" (۵)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں اُردو کی اَب تک ادبی تاریخوں میں تکنیک کا بحران بھی تاریخ نگاری کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے۔ اَب تک کی تواریخ میں تاریخی شعور، تاریخیت اور ارتقاء کے تصورات کو احسن انداز میں بروئے کار نہیں لایا گیا ہے اور نہ ہی اس سے مثبت نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ ہمارے ادبی مؤرخین کے سامنے بس ایک ہی کام رہا کہ ادب کے رُجحانات اور ادبی اصناف کے ارتقائی مراحل اور ادب میں کیے جانے والے تجربات کو تاریخِ ادب سمجھ کر تاریخ کے سپرد کر دیا جائے تو بس معرکہ سر ہو گیا اور یہ روّیہ اس ضمن میں بحران پیدا کرتا چلا گیا،

کیونکہ تصورات کا دائرہ کار نہایت محدود تھا اور اس محدود دائرہ عمل میں رہ کر اور ادبی تاریخ نگاری کو متعلقہ معاون علوم سے الگ رکھ کر ہم ایک معیاری ادبی تاریخ سے آنکھ کیسے ملا سکتے ہیں ان کے خیال میں یہ روّیہ ادبی تاریخ کے لیے کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں بلکہ اس تناظر میں ادبی تاریخ نگاری کے لیے ایک صحت مند سمت کا تعین کرنے سے قاصر رہیں گے:

> "اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ادبی تاریخ، ادب کے رُجحانات اور ادبی اصناف کے ارتقا اور ادبی تجربات کی تاریخ کا نام ہے تو آپ ادبی تاریخ کے لیے بحران پیدا کر رہے ہیں۔ بات سوچنے کی یہ ہے کہ اِس دَور میں ایسے محدود تصورات کی بنیاد پر کسی ادبی تاریخ کی تشکیل کی جاسکتی ہے؟ کیا اس عہد میں ادبی تاریخ کو علیحدگی میں رکھا جاسکتا ہے۔"(۶)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں ایک ادبی مورخ کو اپنی مساعی میں ایک متوازن روش اختیار کرنی چاہیے۔ اسی روش کی بدولت وہ اپنے کام میں حسنِ انتخاب کا اہتمام کر سکتا ہے اور ظاہر ہے حسنِ انتخاب سے ہی حسنِ نظر ممکن ہے اور بلاشبہ اسی حسنِ نظر کی دین آگے چل کر ادبی تاریخ کو بیزاری سے بچا سکتی ہے اور ادبی تاریخ کے خشک تاثر کو ختم کر کے اسے قاری کے لیے دلچسپ اور مطالعہ کے قابل بنا دیتی ہے۔

مزید برآں ان کے خیال میں ایک ادبی مورخ کے پاس کچھ ایسے اوصاف ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں کہ جن کی بدولت وہ اپنے کام کو وقیع بنا سکے۔ ادبی مورخ کا کردار بہت مشکل لیکن بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک ادبی مورخ کو تاریخ کے کرداروں کا ہم سفر اور ہم نشیں ہونا از حد ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب وہ ادبی تاریخ کے منصوبے پر کام کرتا ہے تو گویا وہ اپنی مہارت اور ہنر سے تاریخ کے کرداروں سے ہم کلام بھی ہو رہا ہوتا ہے اور ان کے درمیان اپنے شب و روز بھی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

ادبی مورخ کو تاریخ کے سفر میں مختلف ادوار کے ساتھ ایک نہیں دو طرح سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ گزرے ہوئے دَور کی ادبی روایات اور ماضی کا حصہ بنے اشخاص کو تفکر کے زاویے سے پرکھ کر ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مطابق:

> "ادبی تاریخ کا مورخ ادبی تاریخ کے تاریک ادوار کو روشن کرتا ہے اور جگمگاہٹ اس کی بصیرت پیدا کرتی ہے اس لیے میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ادبی مورخ کو صرف حقائق اور ان سے متعلقہ مباحث ہی میں نہیں اُلجھنا چاہیے اسے اپنے مطالعات سے

تاریخ کی بصیرت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ادبی مورخ کا ذہن قدرے تخلیقی ہونا بھی ضروری ہے۔ حقائق کی مدد سے وہ متخیلہ سے کام لے کر کسی دَور کی اصلی تخلیقی دنیا کا نظارہ کر سکتا ہے۔ اُردو ادب میں اس قسم کے کام کی سب سے خوبصورت مثال "آبِ حیات" ہے۔ آزاد کے انتہائی زرخیز متخیلہ نے دلی اور لکھنو کی ادبی محفلوں اور شعرا کے جو مرقع تیار کیے ہیں ان کے رنگ کبھی نہیں مرجھا سکتے۔"(۷)

ایک ادبی مورخ کے محقق اور نقاد ہونے کے بارے میں بھی مختلف نقطۂ نظر سامنے آتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں اُردو کی ادبی تواریخ میں مورخین جب کسی تحقیقی معاملے میں اُلجھے تو ان کا سارا زور کسی ایک تحقیقی نکتے پر ہی صرف ہوتا رہا۔ وہ یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ ان کا اصل کام تاریخ نگاری ہے اور یہ کہ ایسی صورت میں اگر کوئی وقیع تحقیق دسترس میں آ بھی جائے تو اس کے لیے تحقیق کا میدان الگ ہے۔ گیان چند نے لکھا ہے کہ:

"فی زمانہ ادبی تاریخ سے وہ سب مطالبے کیے جا رہے ہیں جو دراصل ادبی تنقید کی ذمہ داری ہے، لیکن یہ زیادتی ہے۔ ادبی تاریخ کو سب سے پہلے تاریخ ہونا چاہیے۔" (۸)

ادبی تاریخ اور تنقید کے تعلق کے حوالے سے گیان چند جین وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسپلر کے مطابق ادبی مورخ کا کام تاریخی تنقید کرنا ہے جو ادبی تنقید سے مختلف ہے۔ وہ ان عوامل کی نشان دہی کرتا ہے جن کے زیرِ اثر تخلیقات وجود میں آئیں۔ وہ کوئی نظریہ قائم کر کے اسے جانچتا ہے اور اس عمل میں وہ کسی حد تک نقاد بن جاتا ہے.... تاریخ کو تنقید سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جب یہ طے کرتے ہیں کہ اپنی ادبی تاریخ میں کن کن ادیبوں کا ذکر کریں گے تبھی ہم اپنے اندر ادبی نقاد سے مدد لیتے ہیں۔"(۹)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کو گیان چند کی اس رائے سے یکسر اختلاف تھا۔ ان کے خیال میں ایک ادبی مورخ تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی کاموں کا تحسین و تجزیہ بھی کرتا ہے اگر وہ ایک بہتر نقاد ہو یہ کام بہتر انداز میں کر سکتا ہے، بجائے ایک محقق کے کہ جس کا کام حقائق کی چھان پھٹک تک محدود ہوتا ہے۔

المیہ یہ رہا کہ محققین نے تنقید کے علاقے کا رُخ نہ کیا اور نقادوں نے تنقید لکھی لیکن ادبی تاریخ نگاری سے اغماض برتا۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے میں ایک ادبی مورخ واقعات رُجحانات اور ادبی کارناموں کی تفصیل کے ساتھ چونکہ ان ادب پاروں کی تحسین اور تجزیہ بھی کرتا ہے تو اس طریق پر وہ بہتر انداز میں مورخ کے منصب سے عہدہ بر آ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا عوامل کا تذکرہ کافی نہیں۔یوں اُن کی رائے گیان چند کی رائے سے یکسر مختلف ہونے لگتی ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> "میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ادبی مورخ کو محقق سے زیادہ نقاد ہونا چاہیے۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ادبی مورخ کی تنقید کمزور ہے تو وہ کبھی بھی اچھی تاریخ ادب نہ لکھ سکے گا۔ ادبی تاریخ میں جو چیز بہت اہم ہے وہ کسی عہد، کسی ادیب، کسی شاعر، کسی نظریے یا رُجحان کا تنقیدی محاکمہ ہے۔یہ تنقید ہی ہے جو کسی بھی مصنف کے ادبی مقام کا تعین کرتی ہے۔" (۱۰)

علاوہ ازیں ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک اچھے ادبی مورخ کے لیے ماضی شناس ہونا ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک مورخ کے اندر ماضی شناسی کی جس قدر سکت ہو گی اتنے ہی بہتر طریقے سے وہ ماضی کے پردے میں پڑے گوشوں کو منور کر سکتا ہے۔

اب ہم ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ادبی تاریخ نویسی کے بارے میں متذکرہ تصورات کی روشنی میں ان کی اپنی کتاب "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" کا جائزہ لیتے ہیں۔اگرچہ اُن کے امتیازی تصورات نے اُردو کی ادبی تاریخ نگاری کو منفرد مقام دیا ہے لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ایک تصور یا نظریے کو کسی عملی صورت میں برتنے کا اہتمام کس قدر ممکن ہے۔نئے معیارات کا دعویٰ اور ان کو بروئے کار لانا یقیناً ایک ایسا عمل ہے جو ذمہ داری بھی مانگتا ہے اور سنجیدگی سے محنت کا تقاضا بھی کرتا ہے۔اب ہمیں یہ سوال درپیش ہے کہ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں تحقیق، تنقید اور ترتیب میں ان اُصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے یا نہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا کہنا ہے کہ ان اوصاف کے بغیر معیاری ادبی تاریخ لکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔جب اُردو میں ادبی تاریخ نگاری پر بہت سے سوالات اُٹھنے لگے اور مکالمے کی ایک نئی صورت پیدا ہو رہی تھی تو روایتی تاریخ نگاری کے مقابل جدید تصورات کے ساتھ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" منظرِ عام پر آئی۔یہ کتاب پہلی بار ۲۰۰۳ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کتاب کو انیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کا پہلا باب ۱۰۰۰ء سے لے کر ہندوستان میں بہمنی ریاست کے قیام تک کے عرصے کو پیش کرتا ہے۔ مورخ نے اس باب میں اُردو کے قدیم لسانی پس منظر کا دِقت نظری سے ایسا تجزیہ کیا ہے جو ایک عالمانہ شان رکھتا ہے۔ اس تجزیے میں اُردو کے ساتھ اب بھرنشوں، شورسینی، مہاراشٹرہ، پشاجی اور پراکرتوں کے تعلق پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں اُردو زبان کے سفر کا ابتدائی مرحلہ دلی اور نواحی علاقوں کی زبانوں کے ساتھ تعلقات کی استواری کا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خلجی اور تغلق عہد میں دکن کی فوجی مہمات کو اسی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ محمد تغلق کی سیاسی حکمت عملی کے نتیجے میں تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں دولت آباد میں نئی سلطنت کے مرکز کا اُبھرنا اور اِسی دَور میں دکن کا سیاسی انتشار اسی باب کا حصہ ہے۔ اس انتشار کی وجہ سے پیدا ہونے والے طاقت کے خلا اور امیرانِ صدہ کی طرف سے بغاوت کی وقوع پذیری اور مرکز گزیر حکمت عملی کا آغاز اور بہمنی ریاست کا قیام بھی اسی باب میں شامل ہے۔ دوسرا باب شمالی ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کے ابتدائی نقوش کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں اُردو زبان کا آغاز مسعود سعد سلمان لاہوری سے ہوتا ہے۔ اُن کا دیوان چونکہ دستیاب نہیں اس لیے امیر خسرو ایسے راویوں پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اِسی باب میں بابا فرید شکر گنج، حضرت امیر خسرو، کبیر اور افضل اور اس کی "بکٹ کہانی" کا تذکرہ شامل ہے۔ تیسرے باب میں گوجری ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں گوجری ادب پر صوفیانہ تصورات کا گہرا اثر دیکھنے میں آتا ہے اور یہی اثر آگے چل کر اُردو ادب پر بھی نظر آتا ہے۔ شاہ بہاؤ الدین باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی اور خوب محمد چشتی کی ادبی خدمات کے ذکر کے بعد وہ اس نتیجے کو پہنچتے ہیں کہ گوجری ادب کی روایت گجرات میں اختتام کو نہیں پہنچی بلکہ مختلف سماجی عوامل کے نتیجے میں یہاں سے دکن منتقل ہو جاتی ہے۔ یوں پہلے تینوں ابواب اُردو کی ادبی روایت کے ابتدائی نقوش کی وضاحت پر مبنی ہیں۔

"اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" کے چوتھے باب میں "گوجری" کے نقل مکانی کر کے "دکنی" میں منتقل ہونے والے مراحل کا تذکرہ ہے۔ اس باب میں دکن کی سیاسی حوالوں سے خود مختاری اور بہمنی ادب کے ابتدائی آثار سے شروع ہو کر ارتقائی منازل پر نظامی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، مشاق لطیفی، شمس العشاق شاہ میراں جی، فیروز اور اشرف بیابانی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد بہمنی حکومت کے زوال کے

اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہمنی سلطنت کے ادبی اثاثوں اور میراث کے بیجاپور منتقل ہونے کی تفصیل اور تجزیہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "بیجاپور کو حاصل ہونے والی ادبی میراث کا سلسلہ بہمنی دَور کے پہلے بڑے شاعر فخر الدین نظامی سے جاملتا ہے در حقیقت فخر الدین نظامی دکنی شعری روایات کا بانی ہے۔ یہفخر الدین نظامی ہی ہے کہ جس کے ہاں دکن کے لسانی شعور کا پہلا گراف مرتب ہوتا ہے اور قدیم اُردو کی اوّلین شکل ادبی منظر پر نظر آتی ہے۔ نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" قدیم اُردو کا نقش اوّل بھی ہے اور بہمنی دَور کے ادب کا پہلا ثمر بھی۔" (۱۱)

بیجاپور کا عادل شاہی دَور "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" کے پانچویں باب کا حصہ ہے۔ مزید بر آں برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، عبدل، شوقی، نصرتی اور صنعتی کی ادبی خدمات کے مفصل بیان کے بعد اس دَور کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> "یہ تاریخ کی ستم ظریفی تھی کہ ۱۶۸۶ء میں بیجاپور پر مغلوں کے قبضے کے بعد یہاں کی ادبی اور لسانی روایت نہایت تیزی سے مٹتی چلی گئی۔ پرانی روایات کا خاتمہ ہو گیا۔" (۱۲)

عام طور پر اُردو کی ادبی تواریخ میں اس نوع کے جملے کم ہی نظر آتے ہیں جن میں مورخ کا تجزیاتی انداز واضح ہو۔ چھٹا باب قطب شاہی عہد کے محمد قلی قطب شاہ، محمود خیالی، وجہی، غواصی، احمد گجراتی، ابنِ نشاطی سمیت اُس عہد کے نامور تخلیق کاروں کی اُن خدمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن کی بدولت اُردو کی ادب روایت مستحکم ہوتی چلی گئی۔ اِس باب میں دکنی ادب کی روایت کے خاتمے کے محرکات، مغلوں کی عسکری مہم جوئی اور یہاں کی زبان کے ساتھ ساتھ ادب پر فارسی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹا باب بیجاپور اور گولکنڈہ کے سقوط پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے میں ولی دکنی، دکنی غزل کو عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔ ساتویں باب میں ولی کے کلام سے مثالیں دے کر وہ ثابت کرتے ہیں کہ ولی دکنی ہی وہ شاعر ہے جس کے وسیلے سے جنوب کی ادبی روایت شمال سے مصافحہ کرتی ہے۔ ان کے خیال میں سراج اورنگ آبادی دکنی ادب کا آخری شاعر ہے جو دکنی روایت کی پہچان بنا ہے۔ آٹھویں باب کو دو حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے کہ پہلے حصے میں ہندوستان کے سماجی ثقافتی اور سیاسی ماحول کا احوال ہے اور دوسرے حصے میں طنز و مزاح کی جو نمایاں صورت بن رہی ہے اس کی تفصیل ہے۔ اس حصے میں جعفر

زٹلی کا خصوصی تذکرہ غالب نظر آتا ہے۔ جعفر زٹلی کے احوالِ زندگی اور اُن کے کلام کا تذکرہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بہت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نویں باب کا موضوع شمالی ہند کی نئی لسانی اور ادبی روایت ہے۔ اُس زمانے میں حالات کے جبر کی بدولت بات کو ذو معنی انداز میں کرنے کا انداز فروغ پا رہا ہے جو آگے چل کر ایہام گوئی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی مقبولیت کے اسباب کا ذکر ہے اور آبرو، شاہ حاتم اور ناجی کے بارے تفصیل ملتی ہے۔ خان آرزو کو اُنھوں نے اس نئی روایت کا "نقش اوّل" قرار دیا ہے[۱۳]۔ اُردو شاعری کے بے مثل ستون سودا، میر تقی میر، درد، قائم، سوز اور میر اثر کے احوالِ زندگی اور کلام پر تنقیدی خیالات کو باب دہم میں جگہ دی گئی ہے۔ اس باب میں مصنف نے ان شعرا کی اُردو ادب اور بالخصوص شاعری کے باب میں خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ ذکر روایتی انداز میں معلومات کی جمع آوری تک محدود نہیں بلکہ مختلف اختلافی نکات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے جس کی بدولت اس باب کی اہمیت اُردو کی عملی تنقید کے ضمن میں بھی بڑھ جاتی ہے۔

"اُردو شاعری کا دبستان لکھنو" اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ اپنے سماجی اور ثقافتی مظاہر کی بدولت اور معاشی ثروت مندی کے لحاظ سے لکھنو اُردو شعرا کے لیے دلکش مسکن رہا ہے۔ لکھنو کے بارے جملہ تفاصیل اس تاریخ کے گیارہویں اور بارہویں باب میں موجود ہیں۔ یہ ابواب لکھنو کے سیاسی اور ادبی ماحول کا احوال لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھنو کو ایک نیا ادبی مرکز گردانتے ہوئے اُردو کی ادبی روایت کی توسیع میں بڑا محرک سمجھا ہے۔ ان ابواب میں میر حسن، انشا، جرات اور رنگین جیسے شعرا کی شاعری کے نمونے، تنقیدی جائزے اور احوالِ زیست قاری کے سامنے آتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج اور دِلی کالج کی ادبی خدمات اور دِلی کی سیاست، تاریخ اور ادبی اُسلوب کی تشکیل کے محرکات کا تفصیلی بیان تیرہویں باب کا حصہ ہے۔ مصنف کی نظر میں دِلی کالج کا سب سے اہم کردار اُردو کی ادبی روایت میں نثر نگاری کا ایک جدید ماحول پیدا کرنے میں ہے۔ اسی طرح ترجمے کے فروغ میں اور زبان کو زیادہ سے زیادہ ثروت مند بنانے میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو بہت اہم سمجھا گیا ہے۔

"اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" کے چودھواں باب میں داستانی ادب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں "باغ و بہار" اور "فسانہ عجائب" کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جبکہ پندرھواں باب سارے کا سارا نظیر اکبر آبادی اور اُن کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ وہی نظیر اکبر آبادی جس نے اپنی شاعری میں ادب

کو شاہوں کی میراث سمجھے جانے کے خلاف علم بلند کیا اور اپنی نظموں میں عوامی معاملات کو موضوع بنا کر برصغیر کے لوگوں کو چونکا دیا۔ اُن کی نظر میں آدمی کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے اور اس کی سب سے بڑی دُشمن مفلسی ہے جو حسن لطافت کو بھی معدوم کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے کچھ موضوعات کی بنا پر یہ رائے دی ہے کہ ان کی شاعری اشرافیہ کی تہذیب کے مقابل کھڑی ہوئی ہے۔

سولہویں باب میں آتش، نسیم، ناسخ، واجد علی شاہ اور امانت لکھنوی اور اُن کے ڈرامے "اندر سبھا" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ موجود ہے۔ فاضل مورخ ان تمام ادیبوں کو لکھنو کے ادبی اختصاص بلکہ ادبی ثقافت کی ترتیب و تزئین کے حوالے سے سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ گویا لکھنو کا خاص رنگ جو اُردو زبان کی روایت میں نظر آتا ہے وہ ان ادیبوں اور تخلیق کاروں کے ہاں دیکھا سب سے نمایاں نظر آئے گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں آمد تاریخی اور پھر سماجی لحاظ سے ایک بڑا واقعہ ہے جس نے ہندوستان کی ثقافت، سماج اور سیاست پر گہرے نقوش چھوڑے۔ یہ اس خطے کی تاریخ کا سب سے متنازعہ ترین دور رہا ہے۔ اس کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی تسلط نے یہاں کے تخلیقی اذہان کو بھی بہت متاثر کیا۔ سترواں باب مذکورہ بالا داستان کو سمیٹے ہوئے ہے۔

اٹھارویں باب میں شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن، ظفر اور شیفتہ کی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ باب گویا اُردو کی ادبی تاریخ میں دبستانِ دلی کے مخصوص رنگ و آہنگ کو پیش کرتا ہے۔ لال قلعہ اور اُس کے اطراف کی زندگی کی جھلک اور خاص طور پر اُس ماحول کی پیش کش جس میں شاہ کی مصاحبت میں مختلف شعرا زبان دانی اور مشاعرے کے کلچر کو پروان چڑھا رہے تھے اس باب کا خاصا ہے۔ فاضل مورخ نے غالب، مومن اور ظفر کے کلام کا تنقیدی جائزہ اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ حصہ تاریخ کے ساتھ ساتھ تنقیدی حوالے سے بھی بہت گراں قدر حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں دبستانِ دلی کے کلاسیکی مزاج کا آخری امین شیفتہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "شیفتہ کے ساتھ دبستان دلی کا وہ کلاسیکی مزاج بھی رُخصت ہوا، جو میر، سودا، درد، غالب اور مومن کی روایات سے عبارت تھا۔ اور جگرداری، درد مندی، دل سوزی، سوختگی، لطافت، راز و نیاز، سرور اور سوز و گداز کی صفات سے مرتب ہوا تھا۔" (۱۴)

انیسویں باب اس تاریخ کا آخری باب ہے جس میں اُردو مرثیہ کی روایت کو تنقیدی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ مصنف نے اُردو مرثیہ کو لکھنو کی مذہبی ثقافت قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ لکھنوی زندگی کا ایک بڑا سماجی حوالہ بھی سمجھا ہے۔ اس باب میں لکھنو کے اہم مرثیہ گو شعرا کے احوالِ زندگی اور کلام کی مثالوں کے ذریعے بحث کو سمیٹا گیا ہے۔

اُردو ادب کی یہ تاریخ منظرِ عام پر آئی تو ادبی تاریخ نگاری کے باب میں ایک منفرد انداز سامنے آیا۔ اُردو ادب کی تواریخ میں مختلف ادوار، اُن ادوار میں ادیبوں کی تخلیقات یا اصنافِ سخن کے اعتبار سے یا نثر اور نظم کو الگ الگ رکھ کر لکھنے جیسے مختلف انداز رائج تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا اصرار تھا کہ اُردو ادب کی تاریخوں میں ادب کے ارتقاء کو تو دیکھا گیا لیکن اس کے سماجی ثقافتی اور سیاسی ارتقا کے تعامل کو نہیں دیکھا گیا۔ اس لیے دونوں کی حرکتوں کو متوازی رکھنا زیادہ احسن عمل ہو گا۔ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں یہ اہتمام سلیقے سے ملتا ہے۔ ابواب بندی کا جو مجموعی تاثر ہے اس میں ادب سیاسی تسلسل کے ساتھ ارتقاءپذیر دکھائی دیتا ہے۔ ادبی تاریخ میں مشاہیر ادب کی تخلیقات یا فن پاروں کا انتخاب بہت احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ بعض مورخین اپنے کام کی جدت یا انفرادیت کی خاطر کسی شاعر یا نثر نگار کے ایسے نمونے شامل کر دیتے تھے جو عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں یا وہ کسی تخلیق کار کی نمائندہ تخلیق کہلوانے کے مستحق نہیں ہوتے۔ ایک طرف وہ انفرادیت کا دعویٰ کرتے تو دوسری طرف اپنی تحقیق کی وسعت پر فخر کرتے لیکن ادبی تاریخ میں کسی تخلیق کار کی صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں اس ضمن میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے جو اس تاریخ کی وقعت کو بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں ایسے اشعار کا چناؤ کیا جو شیعہ مسلک سے قریب تر تھے جبکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے نبی کے حوالے سے اُن کے کلام کا انتخاب کیا۔ گویا ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک مسلک کلچر ہے جبکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں مذہب کلچر کا نمایاں وصف ٹھہرتا ہے۔

"اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں کسی شاعر کے کلام کے تجزیے کے بعد اسے کسی مقام پر روک کر مصنف آگے نہیں بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اس کے عہد میں اس کا اثر اور اس کے بعد کسی نئے عہد میں اس کی موجودگی اور نئے عہد کے ساتھ اس کے برتاؤ کو ایک تسلسل دینا اس ادبی تاریخ کی انفرادیت ہے۔ مثلاً سراج اورنگ آبادی کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تحریر کا انداز قابلِ غور ہے:

"شمال کے لسانی غلبہ کا پہلا نقش سراج اورنگ آبادی ہے جس کی شاعری ایک نئے شعری سفر کی پہچان بن گئی ہے۔ ولی شمالی ہند اور دکن کے دوراہے پر کھڑا تھا مگر سراج اس دوراہے سے گزر کر شمال کی لسانی روایت کا ہم سفر بن چکا تھا۔ آئندہ مباحث میں ہم سراج اور دیگر شعراء کا ذکر کریں گے۔" (۱۵)

ایک ادبی مورخ صرف واقعات کو ترتیب دے کر تاریخ نگاری کا حق ادا نہیں کر سکتا ہے اس کے پاس واقعات کو اُن کے حقیقی مناظر میں سمجھنے کی صلاحیت، ان کے پس پردہ محرکات اور ان کے ممکنہ نتائج کے ادراک کا ہونا از حد ضروری ہے۔ ورنہ ادبی تاریخ واقعات کا ایک روزنامچہ رہ جائے گا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مورخ کے پاس کسی عہد کو مجموعی طور پر پرکھنے کی بصیرت کا ہونا بھی از حد لازم ہے ورنہ ایک مورخ اس عہد کی تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ اُردو کی ادبی تاریخوں میں بالعموم اس طرح کا اہتمام کہیں نظر نہیں آتا ہے ۔ اگر کسی مورخ کے پاس ایسی کوئی کاوش ہے بھی تو وہ اتنی اجمالی ہے کہ ادبی تاریخ اس حوالے سے اپنی وقعت کا احساس دِلانے سے قاصر رہتی ہے۔ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں یہ اہتمام بہت واضح ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ نگاری کی ذیل میں اپنے نظریات کی وضاحت میں بھی یہ بات کی تھی اور تاریخ لکھتے ہوئے بھی اپنے انھی تصورات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" آغاز سے لے کر اختتام تک خاص اہتمام اور منصوبہ بندی کے تحت لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے اس منصوبے کا آغاز ۱۹۹۴ء میں کیا اور اس کے پس منظر میں اس منصوبے کے آغاز سے کم و بیش تیس سال قبل پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ ادبیات میں اُن کی مصروفیات کار فرما تھیں، پھر محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" اور رام بابو سکسینہ کی کتاب "تاریخ ادبِ اُردو" کو مرتب کرتے وقت حواشی اور تعلیقات کا اہتمام کیا تو ان کا تاریخ نگاری کا عزم اور بھی پختہ اور اُن کے منصوبے کے خدوخال اور بھی واضح ہوتے گئے۔ اُردو کی ادبی تاریخوں میں بعض مقامات پر یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ تاریخ تسلسل میں سفر نہیں کر رہی بلکہ کچھ واقعات ہیں جنہیں جوڑ کر تاریخ بنایا گیا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ میں ادبی واقعات اور تخلیقات کی متوازن کڑیوں کو جوڑ کر ایسی تاریخ سامنے لائی گئی ہے جو محض واقعات کی ترتیب نہیں ہے بلکہ تاریخ ایک سیال کی مانند دھیرے دھیرے سفر کرتی نظر آتی ہے۔

"اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" ایک اور خوبصورت اور مفید اہتمام یہ بھی ہے کہ واقعات میں جہاں جہاں سنین درج میں وہاں ہجری سنین کے ساتھ ساتھ عیسوی سنین کا اندراج بھی کیا گیا ہے جس سے قارئین کے لیے کسی بھی عہد یا واقعے کو سمجھنے میں خاصی آسانی ہو جاتی ہے اور ادب کے قاری کے ذہن اس عہد کا ایک واضح نقش آجاتا ہے۔ اِس تاریخ کی ایک اور انفرادیت اس میں شامل تصاویر اور نقشوں کی موجودگی ہے۔ ظاہر ہے یہ تصاویر اور نقشے قاری کے تخیل کو مہمیز دیتے ہیں اور اس کے وژن کی وسعت کا سامان بنتے ہیں۔ اس تاریخ میں شامل نقشے ایک طرف علاقوں اور ریاستوں کی حد بندی کی صورت قاری کے لیے ابلاغ میں معاون ٹھہرتے ہیں دوسرے طرف اُردو کی ادبی روایت کی ہجرت اور قیام کی بھی منظر کشی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اس جدت پسندی نے ادبی تاریخ کو ایک داستان سے نکال کر ایک بصری کارروائی میں تبدیل کر دیا ہے جس میں قاری کی دلچسپی دوچند ہو گئی ہے اور ایک عام سا قاری بھی اُردو ادب کے سفر کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی آشنا ہوتا جاتا ہے کہ لکھنو ہندوستان کی ریاست کے کس حصے میں واقع ہے۔ لکھنو کا دہلی سے زمینی سفر کس سمت میں ہے اور ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک مثبت اثر اور بھی ہوا ہے کہ پہلے جو ریاستی تغیرات قاری کے لیے ہوا میں یا خلا میں موجود تھے اَب وہ زمین پر نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔

اِسی تسلسل میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں ادبی مشاہیر کے تعارف میں روایتی انداز اپنانے کی بجائے ان کی شخصیت کی قلمی تصاویر بنائی ہیں کہ یہ مشاہیر قاری کے سامنے چلتے پھرتے دِکھائی دیتے ہیں۔ یہ تصور اور پیکر اپنے لباس کی تراش خراش، چہرے کی وضع قطع اور دیگر حوالوں کے ایسے منظر دِکھاتے ہیں کہ ایک مکمل صورت جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔ اس پہ مستزاد کہ وہ کسی شخص کی تصویر اس انداز سے بنانا شروع کرتے ہیں کہ قاری ایک تجسس کی حد میں داخل ہو جاتا ہے اور تحریر میں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ قاری کا اپنا قیاس اس دلچسپی کو دوچند کر تا جاتا ہے۔ ایسی ادبی تاریخ کا مثالی نمونہ، جو بظاہر خشک موضوع کی حامل ہوتے ہوئے قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر لے، ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "دلی کی بدحالی کے سبب خستہ حال نظر آنے والا یہ شاعر قدمائے دلی کا لباس پہنے تھا سر پر سبز عمامہ بڑے گھیر کا پاجامہ.... گلے میں خاک پاک کا کنٹھا۔ دائیں ہاتھ میں ایک چواسی، اس میں کچھ کچھ دعائیں کندہ، چھنگلی بلکہ اور اُنگلیوں میں بھی کئی انگوٹھیاں اور داڑھی کو مہندی خضاب لگا ہوا، قد اس کا میانہ اور رنگ گورا تھا۔ یہ قدیم الوضع شاعر میر تھا۔" (۱۶)

ایسے اقتباسات تاریخ کے سیاق سے ہٹ کر آزادانہ قرات میں کسی خاکے یا خود نوشت وغیرہ کا ٹکڑا لگتے ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ میں مختلف شخصیات کے مرقعے اسی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

ادبی تاریخ نگاری کی ذیل میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ادبی تاریخ میں دبستانوں کا تصور اُردو اَدب کی تاریخ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں اَدب کا کلی ارتقاء اپنی ایک شکل نہیں بنا پاتا۔ مثلاً اس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ شمالی ہند میں اَدب اور سماجی عمل کی پرتیں اور ہیں جبکہ جنوب میں اس کا عکس کچھ اور ہے۔ ویسے بھی ادب کو علاقائی تقسیم میں لا کر دیکھا جائے تو محسوس ہونے ہوتا ہے کہ اُردو ادب الگ الگ علاقوں یا خطوں میں پرورش پاتا رہا ہے اور دوسرے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک علاقے میں کون سی تحریک اپنے عمل سے گزر رہی تھی اور دوسرے علاقے میں اَدب کس تحریک کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں دبستانوں کا تصور موجود ہے حتیٰ کہ لکھنو دہلی اور دکنی اَدب کو دبستان لکھنو، دبستان دہلی اور دبستانِ دکن و گجرات کی شکل میں پیش کیا گیا گیا ہے، لیکن ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا کمالِ ہنر یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تکنیک اور اس کی عملی شکل سے اس تصور کو قائم نہیں ہونے دیا کہ برصغیر میں اُردو ادب الگ الگ خطوں میں الگ الگ پہچان سے فروغ پا رہا تھا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے دبستان کو کسی عقیدے یا مذہبی تصور کی بنیاد پر کھڑا نہیں کیا ہے بلکہ اُن کے نزدیک یہ دبستان تہذیبی سطح پر اَدب کو توانا تر کر رہے تھے۔

متذکرہ تاریخ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنے اُسلوب کو تاریخ نگاری کے روایتی رنگ سے نکال کر قصے گوئی کے قریب تر لے گئے ہیں۔ یہ عنصر قاری کی دلچسپی کو دوچند کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ادبی تاریخ نگاری کے مغربی تصور سے متاثر ہیں، ظاہر ہے ان کا اُسلوب بھی اُسی رنگ کے قریب ہو جاتا ہے۔ ادبی تاریخ کو ایک حوالے سے قومی سوانح عمری بھی کہا جاتا ہے اس لیے ادب کا اُسلوب معروضی ہونا مشکل ہے۔ اس نظریے کو لے کر چلیں تو ادبی تاریخ کہانی کے انداز میں ہی لکھی جا سکتی ہے۔

تکنیک کے حوالے سے ایک اور ضروری بات یہ کہ اُنھوں نے "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" میں فلیش بیک کا سہارا لیا ہے۔ کسی شاعر کے حال کے بیان میں وہ ماضی میں پہنچ جاتے ہیں اور مختلف حوالوں سے اس شاعر یا شخصیت کے ہر روپ کو کھنگال کر سامنے لے آتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" کی منفرد حیثیت کا تعین کرنے کے لیے اُردو ادب کی دوسری تواریخ سے موازنہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی تفصیل بہت طوالت اختیار کرے گی۔ ڈاکٹر

تبسم کاشمیری کے خیال میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخِ ادبِ اُردو" کے بعد جتنی تواریخ لکھی گئی ہیں ان میں روایتی تکنیک اور تاریخ نگاری کے بارے روایتی تصورات کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان میں بہت زیادہ امتیاز نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "تاریخ اَدبِ اُردو" گزشتہ تواریخ کے مقابل ایسی تاریخ ہے جس میں تاریخ نگاری کا اصل تصور موجود ہے اور ادبی ارتقاء کے تسلسل اور تحقیقی لحاظ سے بھی یہ بہترین کارنامہ ہے۔ یہ کتاب منضبط طریق پر اُردو ادب کو سیاق و سباق میں پیش کرتی ہے، لیکن مورخ ڈاکٹر جمیل جالبی پر اکثر محقق ڈاکٹر جمیل جالبی غالب آجاتا ہے۔ اُنھوں نے کسی تحقیقی نکتے پر اپنی توانائیاں صرف کرتے ہوئے اس مرحلہ کو اتنا طول دے دیا کہ تاریخ کا عنصر گم ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے خیال میں ایک ادبی مورخ کو محقق سے زیادہ بہتر نقاد ہونا چاہیے کہ ادبی کارناموں کا مقام مرتبہ بھی متعین کرنا ہوتا ہے اور جب یہ مرحلہ خوش اُسلوبی سے طے کر لیا جائے تو ادبی تاریخ کی وقعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس لحاظ سے "اُردو ادب کی تاریخ" کا ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "تاریخ ادبِ اُردو" سے موازنہ مناسب ہو گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا شمار اُردو کو بلند پایہ مورخین میں ہوتا ہے۔ اُن کی تاریخ جس قدر تحقیقی عرق ریزی سے مزین ہے اُردو کی کسی دوسری تاریخ کو وہ اعتبار حاصل نہیں لیکن اس تاریخ پر اب تک لکھے گئے تمام مضامین میں غالباً سب سے وقیع مقالہ رشید حسن خان کا ہے جنھوں نے اس کی تحقیقی وقعت کو کھل کھلا کر چیلنج کیا ہے۔ تاہم اُن کی محنت شاقہ کے معترف بھی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "جمیل جالبی کی مرتب کی ہوئی یہ تاریخ فرد واحد کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ انفرادی کوشش، اس "پنچایتی پیوند کاری" سے بہتر ہے کہ یہ مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی (اگر اس کتاب کے آخر میں شامل ضمیموں سے قطع نظر کو روا رکھا جائے) کتاب پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولف نے محنت کی ہے۔ ان کے نقطہ نظر اور طریقِ کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تعلق خاطر کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔"(۱۷)

"پنچایتی پیوند کاری" سے اُن کا اشارہ "علی گڑھ تاریخ ادبِ اُردو" کی طرف ہے جس میں مختلف مصنفین کے مضامین شامل کر کے اسے تاریخ کا نام دیا گیا تھا۔ اسی نوعیت کا کام پاکستان سے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی زیر نگرانی "تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند" کیصورت میں سامنے آچکا ہے۔ ان تواریخ

کے برعکس "تاریخ ادبِ اردو" اپنے زمانی تسلسل کے ساتھ خود ڈاکٹر جمیل جالبی کی اپنی کاوش ہے جس میں تاریخ کو عرق ریزی اور بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے، لیکن اس میں کچھ مقامات پر ایسی اغلاط بھی ہیں جن کی وجہ سے اُن کی تاریخ نگاری کے معیار پر کچھ سوالات بھی اُٹھتے ہیں۔ اُن کی "تاریخ ادب اُردو" میں کہیں کہیں حوالہ جات کا معیار کم درجے کا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حوالہ جات پر استدلال کی بنیاد کھڑی کی جائے تو وہ بہت بہتر نہیں ہو گی۔ چند مقامات پر حوالہ جات ویسے ہی غائب ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سنین کے تعین میں مطابقت نہیں ہے۔ صفحہ نمبر ۵۳۱ پر "ولی" کے دیوان کے دِلی پہنچنے کا جو سال درج کیا گیا ہے وہ نظر ثانی کا متقاضی ہے۔ دوسرا ہجری اور عیسوی سنین بھی ایک دوسرے کے مطابق نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں ڈاکٹر جمیل جالبی کو محاسنِ کلام کی تفہیم اور ان کے بیان پر کمال حاصل ہے لیکن ولی اور سراج کے بارے میں لکھتے ہوئے اُن کے تنقیدی تجزیے تاریخ نگاری سے کہیں آگے نکل جاتے ہیں۔ پھر ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں ضرورت سے زیادہ طولِ بیان ہے۔ رشید حسن خان نے یوں تو اپنے ضخیم مقالے میں بہت سے ایسے نکاتِ اعتراض اٹھائے ہیں جو اس تاریخ کے استناد پر سوال اُٹھاتے ہیں لیکن ایک دو نکات ایسے ہیں جو اُردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے اٹھائے گئے ہیں اور بہت جینوئن ہیں۔ خدا معلوم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے درجے کا محقق کس طور پر اس قسم کے بیانات داغ سکتا ہے۔ رشید حسن خان لکھتے ہیں:

> "مولف نے جگہ جگہ اردو کو مسلمانوں سے اور اسلام سے اس طرح وابستہ کیا ہے جیسے ان میں لازم و ملزوم کی نسبت ہو۔ پاکستان میں تہذیب اور ثقافت کے مسائل جس طرح معرضِ بحث میں لائے جا رہے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ جذباتی سطح پر تو یہ دل خوش کرنے والی بات ہو سکتی ہے لیکن لسانی ارتقا کی حقیقی بحث کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔ لفظوں کو مسلمانوں اور ہندوؤں سے منسوب کرنا بھی غیر اصولی بات ہے اور مولف نے یہ کیا ہے....پاکستان میں یہ رجحان نشو و نما پا رہا ہے کہ مختلف تہذیبی مظاہر کو "اسلامی" بنا لیا جائے۔ زبان بھی اس کا شکار ہوئی ہے۔"(۱۸)

اِسی طرح کئی اور مقامات پر ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے اس تاریخ کی قدر و قیمت پر سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُردو ادب کی تواریخ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "تاریخ ادبِ اُردو" اپنی وسیع معلومات اور تحقیق کے اعتبار سے ایک جامع تاریخ بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے سامنے یہ سوال بہر کیف موجود تھا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ کی موجودگی میں ایک نئی تاریخ کا جواز کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی تاریخ میں ادبی تاریخ نگاری کی کہنہ روایات سے انحراف بھی کیا اور ان کا اصرار یہ بھی تھا کہ ادبی تاریخ نگاری میں ادبی تاریخ کے اصل تصور اور اس کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ پھر اُنہوں نے ادبی واقعات اور روایات کو ترتیب لگا کر تاریخ نہیں لکھی بلکہ اس دور کے سماجی علوم مثلاً اقتصادیات، دیومالا، سیاست، تہذیب و ثقافت اور نفسیات کے وسیع پسِ منظر میں ادبی واقعات کے محرکات کو سمجھا، ان کی قدر و قیمت کے تعین میں تنقیدی شعور سے کام لیا اور تاریخ کو تحقیق کا روزنامچہ بنانے سے گریز کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ میں جو فنی سقم اور غلط معلومات درج تھیں ان سے بچتے ہوئے اپنی تاریخ کی صحت کو فوقیت دی ہے۔

اس دنیا میں کوئی بھی چیز، کوئی بھی کام حرفِ آخر نہیں ہے اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہر قسم کی کوتاہی سے مبرا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جہاں عرق ریزی سے اپنی کتاب کو مرتب کیا ہے اور جہاں وہ ادبی تاریخ نگاری کے نظریات کو اپنی کتاب میں عملی شکل دے کر تاریخ نگاری سے انصاف کر رہے ہیں وہاں کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ایک ناقد اپنے سوال سے قاری کو متوجہ کر لیتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ایک طرف مصحفی، جرات اور شیفتہ کے احوال میں اپنے قلم کو تفصیل نگاری میں مگن رکھا لیکن دوسری طرف ظفر اور رنگین پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے جس سے ان کی تاریخ نگاری کے توازن میں ایک خلل نظر آنے لگتا ہے۔ کچھ مقامات پر الفاظ کے معنی کے تعین میں ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا گیا ہے۔ پھر طباعت کی بھی کچھ غلطیاں ہیں، لیکن اُردو ادب کی ایک معیاری اور جامع تاریخ کی جب بھی تعریف کی جائے گی ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اُردو ادب کی تاریخ کے تذکرے کو فوقیت ملے گی۔ اُنھوں نے اپنے اُسلوب میں غیر تنقیدی اصطلاحوں کے استعمال سے بھی قاری کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" اپنے اختصار، جامعیت، شگفتہ اُسلوب تنقید، تحقیقی حوالہ جات، زمانی ترتیب، کتابیات، معلومات، نظریہ سازی اور منصوبہ سازی کے ساتھ ساتھ نقشہ جات اور اپنی علمی اور ادبی حیثیت سے جدید دَور کی ایسی ادبی تاریخ ہے جس کو بلاشبہ اُردو ادب کی تاریخوں میں ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب اُردو کی ادبی تاریخ میں ایک نئی جہت کا تعین کرتی ہے۔ یہ ادبی تاریخ بیک وقت تنقید، تاریخ، نفسیات اور فلسفہ کی کتاب معلوم ہوتی ہے جسے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے کہانی کہنے کے انداز نے اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے بقول:

"یہ موقع دراصل تاریخی لمحہ ہے جب اُردو ادب کی تاریخ ایک نئے نقطہ نظر سے پوری بلیغ اشاریت اور جدید طرفہ کاری کے ساتھ لکھی گئی ہے۔" (۱۹)

مزید لکھتے ہیں:

"تبسم کاشمیری نے پورے اُردو ادب کو ایک اکائی کی طرح دیکھا اور سمجھا ہے اور اسی اعتبار سے اسے تولنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے، یہ کوشش دکنی دور کے سلسلے میں خاصی دشوار تھی مگر اسے بڑی سہولت اور خاصے صبر وتوازن سے انجام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے دکنی الفاظ اور تراکیب جابجا راستہ روکتی ہیں اور ادب فہمی میں رکاوٹ بنتی ہیں مگر تبسم صاحب کا اندازِ تنقید اسے عبارت کے متن میں بڑی خوبصورتی سے کھپاتا چلا جاتا ہے اور ان کی جمالیاتی کیفیات کو جہاں تک ہو سکا ہے برقرار رکھتا ہے۔"(۲۰)

اِسی طرح ڈاکٹر ریاض قدیر کے بقول:

"ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب "اُردو ادب کی تاریخ" اس نقطہ نظر سے اُردو ادب کی تاریخوں میں ایک اہم پیش رفت ہے کہ اس تاریخ میں شعر وادب کے حوالے سے انسانی شعور کی حرکت اور تسلسل کو تاریخ کے جدید نظریات کی روشنی میں دیکھا اور دِکھایا گیا ہے۔" (۲۱)

اُردو ادب کا سفر جاری ہے۔ نئے واقعات، نئے تجربات اس سفر کے سنگِ میل ہیں۔ اُردو ادب کی تواریخ لکھی گئی ہیں اور مستقبل میں بھی لکھی جائیں گی۔ یہ سفر رُکنے کا نہیں ہے لیکن تاحال اُردو ادب کی تواریخ میں اپنی منفرد خصوصیات کی بناء پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب "اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک" کو جو معتبر مقام حاصل ہوا ہے وہ مصنف کو ایک سنجیدہ اور نبض شناس ادبی مورخ کے طور پر زندہ رکھے گا اور یہ کتاب اُردو ادب کی تواریخ میں خصوصیت کی بناء پر ایک حوالہ بنی رہے گی۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو، جلد دوم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء)، ص ا

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، اُردو میں تاریخ نویسی، مشمولہ: تاریخ، (لاہور، جنوری ۲۰۰۷ء)، شمارہ نمبر ۳۲، تاریخ نویسی نمبر، ص ۱۰۸

۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰

۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ: تخلیقی ادب، (اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، جنوری ۲۰۰۸ء)، شمارہ نمبر ۵، ص ۴

۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، ص ۱۳

۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ: تخلیقی ادب، شمارہ نمبر ۵، ص ۶

۷۔ ایضاً، ص ۸

۸۔ گیان چند جین، ادبی تاریخ، مشمولہ: اردو کی ادبی تاریخیں: نظری مباحث، مرتبہ: سلمان احمد، (حیدر آباد: قصر الادب، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۰۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۱۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ: تخلیقی ادب، ص ۱۰

۱۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، ص ۱۸۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۸۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۹۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۰۳

۱۷۔ رشید حسن خان، تاریخِ ادبِ اردو (جلد اول) ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ: اُردو ادب کی تاریخیں: تنقید و تجزیہ، مرتبہ: اورنگ زیب نیازی، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۴۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۱۔۲۵۲

۱۹۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ: تبسم کاشمیری، مشمولہ: ادبی تاریخ نویسی، مرتبہ: سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۵۱

۲۰۔ ایضاً، ۴۵۲

۲۱۔ ریاض قدیر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، مشمولہ: اورینٹل کالج میگزین، (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۱ء)، جلد ۸۶، ص ۹۵